

اقبال بحیثیت قومی شاعر

شرف الدین اصلاحی

ایک اعتبار سے ہم اردو کے شاعروں کو دو گروہوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک قسم ان شاعروں کی ہے جنہوں نے محض شاعری کی ہے۔ ان شاعروں کے سامنے کوئی مقصد نہ تھا۔ ان کی شاعری حسن و عشق کے مضامین تک محدود ہے۔ وہ اپنی شاعری میں زیادہ تر باتوں کی طوطا مینا بناتے ہیں۔ ان کی شاعری صناعتی اور بسا اوقات صنعت گری معلوم ہوتی ہے۔ دوسری قسم میں وہ شعراء آتے ہیں جنہوں نے اپنی شاعری سے قوم کی اصلاح کا کام لیا اور اپنی شاعری کے ذریعے سوئی ہوئی قوم کو جگانے کی کوشش کی ہے۔ ایسے ہی شاعروں کو ہم قومی شاعر اور ان کی شاعری کو قومی شاعری کہتے ہیں۔

آج سے دو سو سال پہلے اگر کوئی یہ کہتا کہ فلاں شخص قومی شاعر ہے تو شاید بات کسی کی سمجھ میں نہ آتی۔ اس لئے کہ اس وقت شعر و شاعری کا مفہوم آج کے مفہوم سے بہت مختلف تھا۔ شاعری خیالی دنیا کی بات تصور کی جاتی تھی۔ شاعر اپنی اور اپنے محبوب کی باتیں کر کے اپنا اور دوسروں کا دل بہلاتا۔ اسے اس سے غرض نہ تھی کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ اس کی دنیا اس کی ذات تک محدود تھی اور وہ اپنی دنیا میں مست و مگن تھا۔ قوم اور قومیت کے لفظ سے نہ عام لوگ واقف تھے نہ شاعر۔ پھر قومی شاعری کیوں کر وجود میں آئی اور قومی شاعر کہاں سے پیدا ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد جب حالات بدلے تو خیالات میں بھی تبدیلی آئی۔ غیروں کی غلامی نے دلوں میں قومیت کا احساس بیدار کیا۔ شاعر قوم کا سب سے حساس طبقہ ہوتا

ہے۔ اس لئے اس کے دل میں قومی ہمدردی کے جذبات کا پیدا ہونا لازمی تھا۔

اقبال کی بہت سی حیثیتیں ہیں۔ مثلاً اقبال بحیثیت فلسفی اور مفکر، اقبال بحیثیت پیغام بر حیات، اقبال بحیثیت مدبر، اقبال بحیثیت مصلح اور ریفارمر، اور ان سب کے بعد اقبال بحیثیت شاعر پھر شاعر ہونے کی حیثیت سے اقبال کی شاعری کے کئی پہلو ہیں۔ ایک تو اقبال کی شاعری کا وہ رنگ ہے جس میں وہ خالصتہً شاعر نظر آتے ہیں۔ اس رنگ میں ان کے شاعرانہ تخیل کی پرواز اور تغزل کا آہنگ نمایاں ہے۔ اس رنگ کی جھلک ان اشعار میں دیکھئے :

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی

مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

تمہارے پیاسی نے سب راز کھولا

خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی

تامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد

مگر یہ بتا طرز الکار کیا تھی

اقبال کی شاعری کا یہ رنگ خالص شاعرانہ ہے، اس میں نہ فکر ہے،

نہ فلسفہ ہے، نہ پیغام ہے، نہ اصلاح کا جذبہ کار فرما نظر آتا ہے۔

اس کے سوا ان کی شاعری کا ایک دوسرا رنگ وہ ہے جس میں فن پر

مقصدیت غالب نظر آتی ہے۔ یہاں شاعری مقصود بالذات نہیں بلکہ مقصود

بالذات کچھ اور ہے۔ شاعر کچھ کہنا چاہتا ہے۔ اور اس کے لئے اس نے

شعر و شاعری کو بطور ذریعہ استعمال کیا ہے۔ اقبال کی شاعری کا یہی حصہ

ہے جس کو ہم اقبال کی مقصدی یا قومی شاعری سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

اقبال کی بے مقصد شاعری کا دور بہت ہی مختصر تھا اور ان کے کلام کا تھوڑا

ہی حصہ اس کے ذیل میں آ سکتا ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد سے برصغیر کے مسلمانوں کی قومی زندگی میں جہاں اور بہت سی نئی باتیں دیکھنے میں آتی ہیں وہاں یہ بھی دیکھا جاسکتا ہے کہ ان کے شاعروں میں بھی تبدیلی آئی۔ شعر و شاعری کی دنیا میں جو تبدیلیاں آئیں ان میں سے ایک اہم تبدیلی یہ تھی کہ شاعر جو ابھی تک اپنی ایک الگ تھلک دنیا بسائے اپنی ذات میں گم رہتا تھا ملک اور قوم کی تباہ حالت دیکھ کر اس کی ہمدردی اور غمخواری میں آنسو بہانے لگا۔ مولانا الطاف حسین حالی نے مسدس لکھ کر گویا است مسلمہ کا مرثیہ لکھا اور اس کے بعد ساری زندگی اسی کے غم میں رویا کئے۔

سینہ کوئی میں رہے جب تک کہ دم میں دم رہا
ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا
اکبر الہ آبادی نے بھی اپنے خاص الداز میں یہی فریضہ انجام دیا۔
مسلمانو! بتاؤ تو تمہیں اپنی خبر کچھ ہے
تمہارے کیا مدارج رہ گئے ان پر نظر کچھ ہے

ان دونوں بزرگوں نے قوم کو اس کا شاندار ماضی یاد دلایا۔ اور حال کی ذلت و ہستی کا احساس دلا کر اصلاح و ترقی کا پیغام دیا۔ قومی شاعر کی حیثیت سے حالی اور اکبر نے ملک و ملت کی جو خدمت انجام دی وہ بہت بڑی ہے۔ اور ان کی بڑائی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ یہ دونوں اقبال کے پیش رو ہیں اور خود اقبال نے ان کی خدمات کا اعتراف کر کے انہیں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ مگر اقبال نے قومی شاعر کی حیثیت سے جو کام کیا وہ کسی اور سے نہ بن سکا۔ اقبال کے سامنے ایک مشن تھا اور اس مشن کو انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ پورا کیا۔

اقبال یہ بات اچھی طرح سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کے زوال کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں کہ انہوں نے اسلام کا سیدھا راستہ چھوڑ دیا ہے۔

اور اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ مسلمان دوبارہ اسلام سے اپنے رشتے کو استوار کر لیں۔ مسلمانوں میں جتنی خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں وہ سب اسلام سے دوری کا نتیجہ تھیں اور ان خرابیوں کی اصلاح اگر ہو سکتی تھی تو صرف اسی صورت میں کہ مسلمان اسلام کی تعلیمات پر عمل کریں۔ اس کے لئے اقبال نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے کلام کے ذریعہ مسلمانوں کے دلوں میں یہ احساس پیدا کیا کہ ان کی حالت خراب ہے اور اس خراب حالت سے نکلنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ دین پر عمل کیا جائے۔

اقبال نے دوسرا کام یہ کیا کہ اسلام کی تعلیمات کو اپنے اشعار میں اس طرح سمو دیا کہ لوگ شوق سے ان کو پڑھیں اور اثر قبول کریں۔ اور تیسرا کام جو سب سے اہم اور ضروری تھا اقبال نے یہ کیا کہ مغربی تہذیب کے اثر سے مسلمانوں میں آئے دن جو نئے نئے فتنے پیدا ہو رہے تھے ان کی روک تھام کی۔ مغرب کے اثر سے مسلمانوں میں جو فتنے اٹھے ان میں سے ایک تصور قومیت (بمعنی خاص) بھی ہے۔ مسلم قومیت (بمعنی ملت) کی بنیاد رنگ نسل اور وطن پر نہیں تھی بلکہ دین پر تھی۔ لیکن مسلمانوں میں جب دینی رشتہ کمزور ہو گیا تو وہ گمراہ کن خیالات کا شکار ہونے لگے۔ اور اس طرح است مسلمہ کی جمعیت پریشاں ہو گئی اور مسلمان گروہوں اور ٹکڑوں میں بٹ گئے۔ مسلمانوں کے لئے سب سے بڑا خطرہ ان کی آپس کی پھوٹ اور نا اتفاقی تھی۔ ذات، برادری، رنگ، نسل اور وطن کی وجہ سے مسلمانوں میں جو اختلافات پیدا ہو رہے تھے اقبال نے ان پر ضرب کاری لگائی اور ان باتوں کو اجاگر کیا جو ان میں اتفاق و اتحاد پیدا کرنے والی تھیں۔

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی دین بھی ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
 کیا زمانے میں پہنچنے کی یہی باتیں ہیں
 (جواب شکوہ)

فرقہ بندی جو مذہب کے راستے آتی ہے وہ بھی ملت کے حصار میں
 رخنہ ڈالنے والی ہے۔ اس لئے اقبال خبردار کرتے ہیں :

مدعا تیرا اگر دلہا میں ہے تعلیم دیں
 ترک دلہا قوم کو اپنی لہ سکھانا کہیں
 وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لئے اپنی زباں
 چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامہ محشر یہاں
 (سید زادے کے نام)

اسلام کا رشتہ ہی اصل میں مسلمانوں کو جوڑنے والا تھا۔ جب یہ
 رشتہ کمزور پڑ گیا تو ملت اور اسلامی قومیت کا تصور لگا ہوں سے اوجھل ہو گیا
 اور اس کی جگہ فرقہ وارانہ تقسیم اور گروہ بندیوں نے لے لی۔ اقبال کہتے ہیں
 کہ مسلمانوں کو اول و آخر مسلمان ہونا چاہئے، باقی سب باتیں فضول ہیں :

یوں تو سید بھی ہو مرزا بھی ہو افغان بھی ہو
 تم سبھی کچھ ہو بٹاؤ کہ مسلمان بھی ہو

ایک صحابی کا واقعہ ہے کسی نے ان سے ان کی ولدیت دریافت کی۔
 جواب میں انہوں نے کہا میرا باپ اسلام ہے اس کے سوا میرا کوئی باپ نہیں۔
 یہی جذبہ تھا جس نے اسلام کے ابتدائی دور میں ”میں اور تم“ کے فرق کو مٹا کر
 پوری امت کو سیسے کی دیوار بنادیا تھا۔ اور بعد میں جب یہ جذبہ کمزور
 پڑ گیا اور اس کی جگہ دوسرے جذبات نے لے لی تو وہی امت دشمنوں کے مقابلے
 میں ریت کی دیوار ثابت ہوئی۔ اقبال کی نظر میں مسلمان کے زوال کی بڑی

جہ یہی ہے کہ قوم کے افراد میں ملی وحدت کا احساس کمزور پڑ گیا ہے۔
سی لئے زور دیکر وہ کہتے ہیں :

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں

سوج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

سوج دریا سے الگ ہو کر اپنا وجود کھو بیٹھتی ہے اور فنا ہو جاتی ہے۔
اسی طرح فرد اگر قوم سے اپنا لاتا توڑ لے تو اس کی زندگی بے معنی ہو جاتی ہے۔
اقبال نے اپنی ایک نظم کا عنوان قائم کیا ہے ”پیوستہ رہ شجر سے امید
بہار رکھ،،۔ اس نظم کا آخری شعر ہے :

ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ

پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

اس نظم میں اقبال نے فرد کے لئے شاخ اور ملت کے لئے درخت کا استعارہ
کیا ہے۔ شاخ اگر اپنی اصل سے جدا کردی جائے تو وہ ہری بھری تو کیا
زندہ بھی نہیں رہ سکتی، اوپر سے چاہے اس کی زندگی کا کتنا ہی سامان کیا
جائے۔ اس کو پانی بھی دیا جائے کھاد بھی دی جائے اور دوسرے وسائل
حیات اس کو زندگی دینے کی تمام کوشش کریں مگر وہ سوکھ کر لکڑی ہو
جائے گی اور اس کا مصروف اس کے سوا کچھ نہ رہے گا کہ اس کو جلا دیا
جائے۔

اقبال فرد کے مقابلے میں جماعت کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور یہی
اسلام کی تعلیم ہے۔

حدیث شریف میں آیا ہے۔ ید اللہ علی الجماعۃ۔ جماعت کے سر پر اللہ کا
ہاتھ ہوتا ہے۔

فرد یا ذات اور فرقے کی طرح وہ علاقائی حد بندہوں کو بھی ملت کے لئے
تباہ کن تصور کرتے ہیں۔ وہ تلقین فرماتے ہیں :

بتان رنگ و ہوا کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
 نہ تو والی رہے باقی نہ ایرالی نہ افغالی
 (طلوع اسلام)

ایک توحید پرست مسلمان جس کا عقیدہ ہو کہ تمام انسان ایک خدا
 کی مخلوق ہیں، یہ زمین خدا کی ہے، مسلمان خدا کا بندہ ہے اس لئے اس زمین
 کے ہر حصے پر اس کا برابر کا حق ہے، وہ اپنے آپ کو کسی ایک جگہ میں محدود
 کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں :

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
 گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

علامہ اقبال ایک کافر اور مومن کا فرق یہ بتاتے ہیں کہ کافر دنیا کی
 جغرافیائی حد بندیوں کا غلام ہے جبکہ مومن ساری دنیا کو اپنی ملکیت سمجھتا
 ہے :

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
 مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہے آفاق

وطنیت کا مغربی تصور مسلمانوں کے لئے سب سے بڑا فتنہ تھا۔ مسلمان
 خدا پرست ہوتا ہے وہ وطن پرست نہیں ہو سکتا۔ لیکن مغرب نے وطن پرستی کی
 لعنت دنیا میں پھیلائی تو مسلمان بھی اس سے متاثر ہوئے۔ اقبال یہ محسوس
 کرتے تھے کہ مسلمان وطنیت کی لعنت میں گرفتار ہو گئے تو اسلام نے ملت
 کا جو تصور مسلمانوں کو دیا ہے وہ ختم ہو جائے گا۔ مسلمان وطن کی بنیاد
 پر مختلف قوموں میں بٹ جائیں گے اور اس طرح ان کی قوت کمزور ہو جائے
 گی اور اس کے بعد دشمن آسانی سے ان کو ختم کر دیں گے۔ چنانچہ انہوں نے
 بڑی سختی کے ساتھ مغرب کے پھیلائے ہوئے غلط اثرات کو دور کرنے کی کوشش
 کی۔ ان کی ایک مشہور نظم ہے جس کا عنوان ہے وطنیت (یعنی وطن بحیثیت

ایک سیاسی تصور کے)۔ اس نظم میں الہوں نے وطن پرستی کے باطل خیالات کو شد و مد کے ساتھ رد کیا ہے۔ اور مسلمانوں کو تلقین کی ہے کہ وہ اس فتنہ سے خبردار رہیں۔

اس نظم کے جستہ جستہ اشعار ملاحظہ ہوں :

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی
وہ بحر میں آزاد وطن صورت ماہی
ہے ترک وطن سنت محبوب الہی
دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی
گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے
اقوام میں مخلوق خدا بٹی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

اقبال وطن پرستی کے خلاف ہیں۔ انہوں نے وطن کے سیاسی تصور کے خلاف آواز اٹھائی ہے جو ملت اسلامیہ کو تباہ کرنے والا ہے۔ ورنہ وطن کی محبت کے فطری جذبے کو وہ برا نہیں کہتے۔ اپنے وطن سے ہر انسان کو لگاؤ ہوتا ہے۔ برصغیر اقبال کا وطن تھا۔ الہوں نے جابجا اس کی محبت کے گن گائے ہیں۔ اس کی جھلکیاں ان کی ابتدائی شاعری میں بکثرت نظر آتی ہیں۔ بلکہ کہیں کہیں ان کا جذبہ حب الوطن حد سے گذرتا دکھائی دیتا ہے۔

جب پہلے پہلے اقبال کی زبان پر قوم کا لفظ آتا ہے تو قوم سے ان کی مراد ہندوستانی قوم ہوتی ہے جس میں ہندو مسلم سکھ عیسائی سبھی شریک ہیں۔ ان کا وطن چونکہ ہندوستان ہے اس لئے وہ ہندوستان اور اہل ہندوستان کی محبت کے گیت گاتے ہیں۔ اقبال کا وطن ایک ایسا ملک تھا جہاں مختلف مذاہب رکھنے والی قومیں آباد تھیں۔ ان میں ذات پات کے امتیازات بھی کارفرما تھے۔ مختلف علاقوں کی زبانیں مختلف تھیں جن کی وجہ سے وہ آپس میں دست و گریباں رہتے تھے۔ یہ غلامی کا دور تھا ایک اجنبی قوم ہندوستان کی حاکم کل بنی ہوئی تھی۔ انگریز ہندوستان میں اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے ہندوستانی باشندوں کے باہمی افتراق کو ضروری سمجھتے تھے۔ اور ایسے فتنوں کو ہوا دیتے تھے جن سے آپس میں اتحاد قائم نہ ہو سکے، بلکہ پھوٹ اور لفاق پڑے۔ اقبال اس صورت حال کو دیکھ کر کڑھتے ہیں۔ وہ ایک طرف ہندوستان کے تمام باشندوں کو ایک تسبیح کے دانے کہہ کر اتحاد و اتفاق اور میل جول سے رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ دوسری طرف اشارہ و کنایہ میں اجنبی اقتدار کے خلاف رائے عامہ کو بیدار کرتے ہیں۔

اقبال کی شاعری کے اس دور میں وطن کی محبت، ہندو مسلم اتحاد اور غلامی کے خلاف نفرت کے جذبات کا اظہار زیادہ ملتا ہے۔

بالگ درا کے ابتدائی صفحات میں ایسی متعدد نظمیں ہیں جو شاعر کے جذبہ حب الوطن کی آئینہ دار ہیں۔ ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کی نظر حدود وطن سے بہت کم باہر جاتی ہے۔ ”تصویر درد“ کے ان اشعار میں وہ ایک محب وطن شاعر کی حیثیت سے جلوہ گر ہیں :

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستان مجھکو

کہ عبرت خیز ہے تیرا سالہ سب فسانوں میں

دیا رولا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا

لکھا کلک ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستان والو
تمہاری داستان تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں
تھے کیا دیدہ گریاں وطن کی لوحہ خوالی میں
عبادت چشم شاعر کی ہے ہر دم باوضو رہنا

ایک دوسری نظم ہے ”صدائے درد“ اس کے چند اشعار دیکھئے :

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے
ہاں ڈبو دے اے محیط آب گنگا تو مجھے

سر زمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے
وصل کیسا ہاں تو اک قرب فراق آمیز ہے

بدلے یک رنگی کے یہ نا آشنائی ہے غضب
ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب

ظاہر ہے کہ اس جگہ سر زمین سے مراد ہندوستان ہے۔ شاعر سرزمین
ہند کے تمام بانیوں کو ایک قوم تصور کرتا ہے اور ان کے درد میں آنسو
بیاتا ہے۔ اور کہیں کہیں تو شاعر کا جذبہ حب الوطن وطن پرستی کی حد
میں داخل ہو جاتا ہے۔ وہ وطن کو تقدس کی نظر سے دیکھتا ہے مثلاً اس دور کی
شاعری میں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں :

کوہ ہمالہ سے خطاب ہے :

ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لئے
تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لئے

اپنی شاعری کے اس دور میں اقبال ”ترانہ ہندی“ لکھ کر اپنے وطن

دوستان کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں :

سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

(ظاہر ہے اس سارے جہاں میں سرزمین حجاز، مکہ اور مدینہ بھی شامل ہے

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستان ہمارا

اسی زمانہ میں وہ ”ہندوستانی بچوں کا قومی گیت“ لکھتے ہیں

اس میں رواداری اور وسیع المشربہ کی لے کتنی بلند ہے۔

چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا

لائلک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا

تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا

جس نے حجازیوں سے دشت عرب چھڑایا

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

ٹوٹے تھے جو ستارے فارس کے آسمان سے

پھر تاب دے کے جس نے چمکائے کہکشاں سے

وحدت کی لے سنی تھی دلہا نے جس مکان سے

میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

یہی نہیں اقبال کے اس دور کے کلام میں ”لیا شوالہ“ جیسی نظم

بھی ملتی ہیں :

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے

تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے

انہوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا

جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

تنگ آگے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا ،

واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے

پتھر کی سورتوں میں سجھا ہے تو خدا ہے
خاک، وطن، کا مجھکو ہر ذرہ دیوتا ہے

شاعر دیر کے ساتھ حرم سے بھی کنارہ کشی اختیار کرتا ہے۔ وطن کی خاک کا ذرہ ذرہ اس کی نظر میں دیوتا کا مقام رکھتا ہے۔ اس دور میں اقبال کے صرف ذخیرہ الفاظ کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ ان کے دل و دماغ پر ہندوستانی قومیت کس طرح چھائی ہوئی ہے۔ اس ایک چھوٹی سی نظم (لیا شوالہ) میں اتنے الفاظ ہیں جو خالص ہندیت اور ہندوئیت کے غماز ہیں۔ برہمن، بت، پیر، دیر، سورتی، دیوتا، شوالہ، دیس، تیرتھ، منتر، ہجاری، بیت، شانتی، بھگت، دھرتی، باسی، مکتی، پریت۔

جیسا کہ صراحت کی جاچکی ہے یہ اقبال کے ابتدائی دور کا کلام ہے، نہ ہنوز اقبال عمر، علم اور تجربہ کے لحاظ سے اس مقام پر نہیں پہنچے تھے، ہر کہ وہ بعد میں فائز ہوئے۔ اسے ہم ان کی شاعری کا عہد طفولیت کہہ سکتے ہیں۔ اس دور میں انہوں نے شعر کہے اور خوب کہے مگر صاف لوم ہوتا ہے کہ ایک مسلمان کی حیثیت سے ان کا شعور ابھی بلوغ کی اس ڈل میں داخل نہیں ہوا ہے جس نے اقبال کو علامہ اقبال، شاعر مشرق، حکیم الامت اور مفکر اسلام جیسے خطابات کا سزاوار ٹھہرایا۔ ہم قومی شاعر کی حیثیت سے اقبال کے افکار و خیالات کا جائزہ لے رہے ہیں۔ گزشتہ سطور میں اقبال کی قومی شاعری کے ضمن میں جو کچھ کہا گیا اس سے یہ تو ضرور واضح ہوتا ہے کہ اقبال کے اندر قومی شعور بیدار ہوچکا ہے مگر یہ بھی صاف نظر آتا ہے کہ ان کا تصور قومیت محدود ہے۔ تاریخی ترتیب سے کلام اقبال کا مطالعہ کریں تو یہ حقیقت روشن ہوکر سامنے آجاتی ہے کہ یہ اقبال کے ذہنی سفر کی پہلی منزل ہے۔ ان اشعار کی روشنی میں اقبال ہندوستان کے قومی شاعر تو نظر آتے ہیں مگر ہم انہیں مسلمانوں کا قومی شاعر نہیں کہہ سکتے۔

جن لوگوں نے کلام اقبال کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس کا کچھ ہی حصہ ایسا ہے جس میں وہ وطنی قومیت کے زیر اثر معلوم ہوتے ہیں۔ اس حصہ کو چھوڑ کر ان کا باقی کلام تمام کا تمام ایسا ہے کہ اس میں قوم سے اقبال کی مراد مسلمان ہیں۔ وطنی اور ملکی قومیت کے گہروند سے اقبال بہت جلد نکل آئے۔ اور وہ مسلم قومیت کا پرچار کرنے لگے۔ وہ اقبال جس نے اس سے پہلے ترانہ ہندی، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت، ہمالہ نیا شوالہ جیسی نظمیں لکھی تھیں وہ ترانہ ملی لکھ کر اپنے اسلامی شعور کا احساس دلاتا ہے۔ ترانہ ہندی کے بعض اشعار اوپر گزر چکے ہیں ان اشعار کے بالمقابل ترانہ ملی کے ان اشعار کو ملاحظہ فرمائیے :

چین و عرب ہمارا ہندوستان ہمارا

مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

سالار کاروان ہے میر حجاز اپنا

اس نام سے ہے باقی آرام جاں ہمارا

بالگ درا کی کچھ لفظوں کو چھوڑ کر اقبال کی شاعری کا دفتر کا د ان کے خالص اسلامی شعور کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے اپنے کلام میں اسلامی تعلیمات، اسلامی تاریخ اور مسلمانوں کے مسائل ہی کو موضوع گفتگو بنایا ہے ان کا کوئی سا مجموعہ کلام ہاتھ میں اٹھا لیں اور کہیں سے بھی ورق ا کر پڑھنا شروع کردیں محسوس ہوگا کہ ایک دردمند مسلمان شاعر، اسلام پیغام کو اپنے کلام کے ذریعہ دنیا کے سامنے پیش کر رہا ہے۔ اقبال اسلام اور مسلمانوں کی بات کس کس زاوئے سے اور کس کس انداز میں کی ہے اس کا جائزہ باعث طوالت ہوگا۔ ذیل میں ہم بالگ درا ہی سے کچھ ایسے اشعار بطور نمونہ درج کرتے ہیں جس سے اندازہ ہوگا کہ اقبال کا اصل تہ قومیت کیا ہے۔

حصہ غزلیات کا ایک شعر ہے :

لڑالا مارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بتا ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے

اقبال کا یہی ایک شعر وطنی قومیت کی نفی کے لئے کافی ہے -

ہانگ درا کی ایک نظم ”مذہب“ میں اور وضاحت سے وطنی اور ملکی
قومیت کے غلط تصور کے آگے اسلامی قومیت کی اصل بنیاد کی طرف اشارہ کرتے
ہیں :

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

خضر راہ میں فرماتے ہیں :

پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصار دیں میں ہو
ملک و دولت ہے فقط حفظ حرم کا اک ٹمر

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
لیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاک کاشغر

جو کرے گا امتیاز رنگ و خوں مٹ جائے گا
ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر

نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہوگئی
اڑ گیا دلہا سے تو مانند خاک رہگذر

اقبال نے یہ اشعار ان اشعار کے بعد کہے ہیں جن میں وطن قومیت کی بنیاد ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں انہوں نے خود ہی اپنے ابتدائی خیالات پر خط نسخ کھینچ دیا۔ اس لئے جب ہم اقبال کا ذکر بحیثیت قومی شاعر کے کرتے ہیں تو ہماری مراد مسلمان قوم ہوتی ہے۔

اقبال کا مقام ایک قومی شاعر کی حیثیت سے بہت بلند ہے۔ وہ صحیح معنوں میں مسلمانوں کے قومی شاعر ہیں۔ مگر ان کا یہ جذبہ قومیت تنگ نظری اور تعصب پر مبنی مرکز نہیں۔ وہ اسلام کے شیدائی ہیں اس لئے اسلامی تعلیم کے مطابق اسلامی قومیت کا گہرا شعور ان میں پایا جاتا ہے۔ لیکن اسلام اور مسلمانوں سے محبت کا نتیجہ دوسروں سے نفرت نہیں۔ الہیں دنیا کے تمام انسانوں سے محبت ہے:

شراب روح پرور ہے محبت نوع انسان کی

سکھایا اس نے مجھ کو مست ہے جام و سبورہنا

بحیثیت قومی شاعر اقبال کا تعارف نامکمل رہے گا اگر ہم ان کی ایک مختصر سی نظم ”شاعر“ کا ذکر نہ کریں۔ اس نظم میں اقبال واضح کرتے ہیں کہ دیگر طبقات اور اداروں کے علاوہ خود شاعر کا تعلق قوم کے ساتھ کیا ہوتا ہے:

قوم گویا جسم ہے افراد ہیں اعضائے قوم

منزل صنعت کے رہ پسا ہیں دست و پائے قوم

ھفل نظم حکومت چہرہ زیبائے قوم

شاعر رنگیں لوا ہے دہذہ بینائے قوم

مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ

کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

—::—()—::—